18

جہاد بالقرآن

صدر مؤسس مرکزی انجمن محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
کا ایک جامع خطاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

© rasailojarai

اقامت دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آئیے ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم و لابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے' اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات' چودھراہٹیں' سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یافتہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے' جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں' جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہو گیا ہے' وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے' اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ع

''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے''

ہوش میں آؤ' اپنی قوتوں کو مجتمع کرو' یہ ایک آندھی آرہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید

© rasailojarai

ہے۔قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳'الفتح:۲۸'الصف:۹)

اوران میں سے دو مقامات پر آیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔یعنی یہ ایک اٹل قانون ہے کہ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہو گا اور بالفعل (Physical) تصادم ہوگا۔اب طاقت' طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔اس کے پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے ''صبر محض'' کہ ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکہ میں یہی حکم رہا کہ اگر تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جا رہا ہے تو لیٹ جاؤ' مگر جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance — یعنی کلمۂ توحید اور کلمۂ طیبہ پر قائم رہو' لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو للکارو اور چیلنج کرو۔اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو۔اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے Armed Conflict یا مسلح تصادم' یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اور اذنِ قتال دے دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ؀﴾ (الحج)

''(آج سے) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مکی دور صبرِ محض کا دور تھا۔مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے

© rasailojaraid.com

اقدام فرمایا اور چھاپے مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو' جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے' مخدوش بنا دیا۔ گویا قریش کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا' کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔

صبر محض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ''مسلح تصادم'' کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے' وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی' برداشت کر رہی تھی' لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ''قتال فی سبیل اللہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکمِ الٰہی آتا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ (البقرۃ)

''(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے' اور وہ تمہیں ناپسند ہے' اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو درانحالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو درانحالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آ گئی

© rasailojaraid

ہے' تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ وفساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے' اس کی ہمارے اکثر اصحابِ علم مختلف تشریحات و توجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے' استحصال بھی فتنہ ہے' ناانصافی بھی فتنہ ہے' لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اِس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ اگر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظامِ حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ﴾ (البقرۃ:۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ﴾ (البقرۃ:۲۱۷) غور کیجیے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ' اپنے ہی بھائی بند' اپنے ہی اعزہ و اقارب مدمقابل تھے' لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ﴾ (الزمر:۳) اور: ﴿اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ﴾ (الشوریٰ:۱۳) سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ...﴾ ''اور چاہے مشرکوں کو یہ

© rasailojaraid
© rasailojaraid

کتنا ہی ناگوار ہو!''

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت و سیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دینِ اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تا کہ ''حق بحق دار رسید'' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (الاحزاب)

''اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا

© rasailojaraid
© rasailojaraid

حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمہ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹریبیونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا' برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں' اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہو سکتا ہے' وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہو سکتا!

© rasailojaraid.

ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں

بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (۹) درجے بن جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطہ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امیدِ موہوم ہے۔ ﴿تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ﴾ ''یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں''۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو

© rasailojaraid.

اُس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے‘ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔‘‘

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرطِ لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقینِ قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

اس آیتِ مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں‘ ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾

اللہ کی محبت‘ اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا

© rasailojaraid.com

حال ہے۔فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔یعنی اپنے باپوں کی محبت' اپنے بیٹوں کی محبت' اپنے بھائیوں کی محبت' اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ ماں' بیٹی' بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائقِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے' ساتویں اس کاروبار کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے' جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے' جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے' کہیں گھاٹا نہ ہو جائے' اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں' جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت' دوسری اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا' کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق و سامانِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر فَتَرَبَّصُوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ''جاؤ دفع ہو جاؤ'' ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابل توجہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظن غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الاّ اللہ

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس

© rasailojarai
© rasailojarai

بات پر دلالت کرتی ہے' بلکہ میرے غور وفکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب و تشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرا یقین قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمہ شہادت' اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' حج اور صوم رمضان' پانچ ارکانِ اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں' لہٰذا میں فرائض دینی کے جامع تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور وفکر کیا ہے' نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ''تواصی بالحق'' قرار دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

﴿الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿١﴾﴾

''ال ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں' پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔''

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقامِ محبوبیت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿٤﴾﴾ (الصف) ''یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

© rasailojaraid

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

''اور جولوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔''

اور سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

''اور جولوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ))

اور:

((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ))

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله۔

© rasailojaraid

''اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زور آور اور زبردست ہے۔''

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالمِ ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے' البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفعِ آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے' کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے' اس پر صرف معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعے اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ﴾ بنی اسرائیل نے آنجناب کا انکار کیا لیکن انہیں عذابِ استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیح قربِ قیامت میں جناب محمد ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا' موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے لحاظ سے حسبِ ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرضِ عین نہیں فرضِ کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ''جہاد'' وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں' جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے

© rasailojaraid

محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ''قتال'' اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایئے جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ)) (۱)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی''۔ بقول اقبال ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

© rasailojaraid.com

جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے' عافیت اسی میں ہے' ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی زبان ہوتی ہے' ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے ___ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب وسنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ''جہاد''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغزو ولم یحدث نفسه بالغزو۔

© rasailojaraid.com

کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ''انقلاب''۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (Levels) بیان کی ہیں' انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation' اس کی نشر و اشاعت' اس کو پھیلانا' اس کو عام کرنا' اسے ذہنوں میں اتارنا' اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا' اس انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہوگئی ہے۔

انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۂ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ:

﴿رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلاَّ فِرَارًا ۝ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝﴾

''اے میرے ربّ! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا' مگر میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کردے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں بآوازِ بلند دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے

© rasailojaraid.com

چکے بھی سمجھایا۔''

لیکن قوم مُردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا' بلکہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۃ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ﴾ ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' یہاں ''قلیل'' وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے' یعنی بہت ہی کم' معدودے چند۔ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی' وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں' بہر حال ساتھی نہ ملے' جمعیت فراہم نہیں ہوئی' لہٰذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے' وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہو گا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے' حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا' ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا' لہٰذا وہ بریٔ الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت و تزکیہ' تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہو گی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں' یعنی دین کا غلبہ' دین کا قیام' دین کا نفاذ' دین کی سربلندی' تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہوسکتا' چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں' ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں' تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہٰذا اقامت دین اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے' اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیضؔ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ

ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے' ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد ﷺ اور درمیان میں تین رسول ہیں' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے' اوّل و آخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی' لیکن کوئی اعوان و انصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوۂ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں' کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد میں مابہ الامتیاز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸'۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ......﴾

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں.....''

بقول شاعر مشرق ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

محمد رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم ﷺ کے اعوان و انصار بنے ہیں کہ ؏ ''ہر چہ باد اباد ما کشتی در آب انداختیم'' والا نقشہ ہے۔ جو غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو' کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ)

''پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور دونوں جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

جہاں آپ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں' اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق و دق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو' اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو' اس میں سمع و طاعت کا وصف و جوہر نہ ہو' اس میں نظم و ضبط نہ ہو' وہ

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

تربیت یافتہ نہ ہو‘ اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو‘ اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے‘ لہٰذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا‘ دعوتِ حق کو قبول کیا‘ اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ‘ اعلائے کلمۃ اللہ‘ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد و مصائب‘ فقر و فاقہ‘ کشمکش و تصادم‘ جہاد و قتال کے مراحل میں جاں نثاری‘ قربانی و ایثار‘ صبر و تحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہار دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا بمصداق ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾۔ چونکہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں لہٰذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجنابؑ کی بعثتیں بھی دونوعیتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ (طٰہٰ) اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت و تبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت و تزکیہ میں ہمہ وقت و ہمہ تن لگے رہے‘ حتیٰ کہ فرعون کے اعراض‘ سرکشی‘ دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ

© rasailojarai
© rasailojarai

صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ﴾ (المائدۃ)

''اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے' اور پشت پھیر کر پیچھے مت پلٹو' ورنہ ناکام و نامراد لوٹو گے۔''

لیکن قوم بزدل اور تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ' دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارضِ مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے' اب تمہاری ہمت درکار ہے' پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی' نافرمانی' بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (المائدۃ)

''اے میرے ربّ! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی

© rasailojaraid
© rasailojaraid

اختیار نہیں‘ پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔‘‘

قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ پاداش اپنا حکم سنادیا:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ﴾ (المائدۃ)

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارض مقدس چالیس سال تک حرام کردی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے رہیں گے‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظم ہو‘ اس میں سمع وطاعت کا جوہر نہ ہو‘ اس میں نظم وضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((آمُرُكُمۡ بِخَمۡسٍ: بِالۡجَمَاعَةِ وَالسَّمۡعِ وَالطَّاعَةِ وَالۡهِجۡرَةِ وَالۡجِهَادِ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ)) (۱)

’’(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزامِ جماعت کا‘ اور سننے اور ماننے کا‘ اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔‘‘

ایک اور روایت میں ((آمُرُكُمۡ بِخَمۡسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اَللّٰهُ اَمَرَنِيۡ بِهِنَّ)) ’’اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے‘‘۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولِ سمع و طاعت پر مبنی ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں‘ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ‘ نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

انقلابی دعوت وتربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو

(۱) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ وسنن الترمذی‘ ابواب الامثال‘ باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

© rasailojaraid.com

اکبرالٰہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

علامہ اقبال نے اکبرالٰہ آبادی کو اپنا مرشدِ معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا ہے: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطۂ عروج پر آتا ہے۔ ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

یہ تربیت ہے‘ یہ تزکیہ ہے‘ یہ تعلق باللہ ہے‘ یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو اور تمنا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے‘ جس کو باطل اور طاغوت سے جا ٹکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبر محض‘ اقدام اور مسلح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے‘ جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے‘ اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت و تبلیغ ہو۔ یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ اسی میں جدال بھی ہے۔ مشرکین‘ ملحدین‘ منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آ گئے ہیں: ﴿اُدْعُ اِلٰى

© rasailojaraid

سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ﴾ (الانعام:۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۂ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ''بِہٖ'' پر ہمارے اکثر اہلِ علم نے کماحقہ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار و تبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۞﴾

''کُل حمد وثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔''

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۞﴾ (قٓ) ''پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے''۔ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں' اس کا ذریعہ' اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اِس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند

© rasailojaraid.

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرامؒ کی غیر مصدقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے' حالانکہ موعظۂ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے' لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں ہیں' جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا' انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے' جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ قرآن مدعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ میں

© rasailojaraid

ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں۔ مگر اِس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

''پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے''۔

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں' جو مدعی ہے ''شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسراءیل:۸۲)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے' دردر سے بھیک مانگ لی' لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت وتزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام ومرتبہ کا معترف ہوں' لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

© rasailojaraid

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

''شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے''۔

غور کیجیے' ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمو دیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (متفق علیہ)

''شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون''۔

پہلا شعر اسی کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیثِ نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے' وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی) انہوں نے سوال کیا کہ حضور ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!'' یہ ہے وہ بات جو دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔

اگر زہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے' اندر کی

© rasailojaraid.

تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب' یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے' ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ''جہاں دیگر شود'' کا اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آ گئی اس کے لیے جہاں بدل گیا' اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی' اس کا زاویہ نظر بدل گیا' اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے' بلکہ ''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالم پیر مر رہا ہے'' والا معاملہ ہے ۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک منظم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت تو پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا' جبکہ آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں' یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو Levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلۂ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا' ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی' کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ''میثاق'' کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر' خود ہی مالک' خود ہی پروف ریڈر' حتیٰ کہ خود ہی

© rasailojaraid

اس کا کلرک اور چپڑاسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا' وہی ''میثاق'' والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ ع ''ہے مشقِ سخن جاری' چکی کی مشقت بھی'' کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا' نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' اور اس کے زیرِ انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمد للہ بعض دردمند اور اہلِ دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہو گئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

الحمد للہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام' اس کے لیے دفاتر' رہائشی کوارٹرز' ہاسٹل' جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات' علوم و معارفِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام' دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس و خطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش' قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کا انعقاد' مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام' ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار' میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے موثر ذریعۂ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ''الھدیٰ'' کے نام سے قرآن مجید کا

© rasailojarai
© rasailojarai

پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ''الکتاب'' کے عنوان سے ایک پروگرام ہو گا' اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسااوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں' میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجیے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو' انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا' وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعۂ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا' وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا' پھر تیسرے سال رمضان ہی میں ''الٓمّٓ'' سیریز چلی' پھر ''الہدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر بالکل درمیان میں ''الہدیٰ'' کا پروگرام ختم ہو گیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ

© rasailojarai

شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (البقرۃ)

''ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔

اس ''الہدیٰ'' کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہو گئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جا رہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ''الہدیٰ'' کے پروگرام کو بنایا' ورنہ ہمیں کون جانتا تھا' اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقۂ تعارف پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آ رہی ہے۔

بہرکیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقۂ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے' اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں' ایک قیام اللیل' دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت و قراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾﴾ (المزمّل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

© rasailojarai

بعد میں جب اس نے ایک معین شکل اختیار کی تو حکم آیا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراءیل:۷۹)

''اور رات کو اِس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو' یہ تمہارے لیے نفل ہے''۔

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں' بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت و تلاوت' یہ دو ہتھیار ہیں جن سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دعوتِ موعظہ اور مجادلہ میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِیْ قُبُوْرِنَا' اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ' وَاجْعَلْہُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَةً' اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنَا مِنْہُ مَا نَسِیْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْہُ مَا جَھِلْنَا' وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَہٗ آنَاءَ الَّیْلِ وَآنَاءَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ لَنَا حُجَّةً یَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ○○

(مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے یہ خطاب مرکزی انجمن کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء میں ارشاد فرمایا تھا۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور قدرے حک و اضافہ کے ساتھ مرتب کر کے میثاق میں شائع کیا۔ بعد ازاں یہ قابل قدر خطاب کتابچے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اب مزید نظر ثانی اور تخریج احادیث کے ساتھ اس خطاب سے حکمتِ قرآن کے صفحات کو مزین کیا گیا ہے۔)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid